ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

مولانا محمد فاروق چریاکوٹیؒ

اور ان کا نظریۂ علوم و تعلّم

جن علما نے گذشتہ صدی کے اواخر میں نام پایا، ان میں مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کا ایک خاص مقام ہے۔ ظاہر ہے کہ جس استاد کی نسبت علامہ شبلیؒ جیسا منبع علم و فن شاگرد لکھے کہ "میری تمامتر کائنات ان ہی کے افادات ہیں" اسے قوم کی علمی تاریخ میں کیسے فراموش کیا جاسکتا ہے؟ لیکن مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کا فیض صرف علامہ شبلی تک محدود نہ تھا۔ دارالعلوم ندوہ کا پورا دور جس میں وہ مدرسِ اوّل رہے، دورِ فاروقی کہلاتا ہے[1]۔ ندوہ کے علاوہ کئی دوسرے مدارس میں اس شمعِ علم نے ضوافشانی کی۔ وہ شاعر بھی تھے۔ کئی ندرہ دار رسالے ان کے قلم سے نکلے۔ ممکن ہے آپ ان کے نقطۂ نظر سے اتفاق نہ کریں لیکن ان کی وسیع علمیت، قدیم علوم سے بے پناہ محبت اور علمی معاملات میں ایک محکم طریقِ کار سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ حیاتِ شبلی میں سیّد صاحب نے ان کا ذکر بڑی محبّت و ارادت سے کیا ہے۔ لیکن زیادہ تفاصیل قدرتی طور پر وہی دی ہیں جن کا تعلق شبلی کی تعلیم سے تھا۔ مولانا فاروق کے تعلیمی نظریوں کا ذکر نہیں کیا۔ بلکہ مولانا کی تصانیف کی جو فہرست انھوں نے درجِ کتاب کی ہے اس میں رسالہ ذخر المعارف تذکرۃ العلوم کا نام نہیں۔ ہمیں اتفاق سے یہ رسالہ دستیاب ہوگیا۔ چنانچہ ہم زیادہ تر اس کی روشنی میں اور کسی قدر مولوی ضیاءالحسن ایم۔ اے کی یادِ ایّام کی مدد سے تقسیمِ علوم اور ان کی اہمیت کے متعلق مولانا فاروق کے خیالات کو پیش کریں گے۔

---

[1] یادِ ایام از مولوی ضیاءالحسن علوی ایم۔ اے ص ۲۲ وغیرہ

مولانا محمد فاروق ایک قدیم علمی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ شاہانِ اسلام نے اپنے عہدِ حکومت میں علما و صلحا اور دینی خدمات بجالانے والوں کے لیے جن خاندانوں کو بلادِ شرقی میں جاگیریں اور زمینیں مددِ معاش کے طور پر دے رکھی تھیں، ان میں یہ خاندان ممتاز تھا۔ "عہدۂ قضا ان کے خاندانوں میں چند صدیوں سے چلا آتا تھا۔" عہدِ انگریزی میں بھی ان کی دنیوی وجاہت برقرار رہی بلکہ بڑھ گئی۔ مولانا فاروق کے والد جناب قاضی علی اکبر چریاکوٹی نے غدر میں انگریزوں کا ساتھ دیا۔ ان ایام میں پرگنہ چریاکوٹ کے تحصیلدار اپنے عہدے سے دست بردار ہو گیا تھا۔ چنانچہ مسٹر ہارن کلکٹر و مجسٹریٹ نے تحصیل کا انتظام قاضی صاحب کے سپرد کیا۔ "آپ نے کمال جانفشانی و دیانت داری سے تحصیل کی محافظت کی اور سلطنت کے ہواخواہ رہے۔ دولتِ برطانیہ نے صلۂ خیر خواہی میں جاگیر و انعام سے مشرف و سرفراز کیا۔"[۵۲]

قاضی علی اکبر کی کوششوں سے خاندان کی دنیوی حیثیت بڑھ گئی لیکن ان کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی اولاد کی تعلیم کا (قدیم طرز کے مطابق) بہتر سے بہتر انتظام کیا۔ ان کے دو بیٹے اپنے وقت کے مشاہیر علما میں سے تھے۔ ایک مولانا محمد فاروق تھے۔ دوسرے ان کے بڑے بھائی مولانا عنایت رسول چریاکوٹی۔ مولانا عنایت رسول نے علومِ معقول و ریاضی و حساب و ہیئت مولانا احمد علی چریاکوٹی سے، حدیث شاہ عبدالعزیز کے ایک شاگرد سے، اور علومِ منقول مُلّا فضل رسول بدایونی سے، جو دو واسطوں سے مُلا بحرالعلوم کے شاگرد تھے، حاصل کیے۔ پھر عبرانی پڑھنے کا شوق ہُوا تو کلکتہ میں جا کر یہودیوں سے عبرانی پڑھی اور توراۃ و انجیل اور دوسرے صحف بنی اسرائیل پر عبور پایا۔ بالآخر وطن آئے۔ یہاں بزرگوں کی چھوڑی اچھی خاصی زمینداری تھی، اسی پر قناعت کی۔ جب سرسید بنارس اور غازی پور میں منصف

---

[۵۲] یہ عبارت اس تقریظ سے لی گئی ہے جو رسالہ تذکرۃ العلوم کے آخر میں درج ہے۔ اس تقریظ میں مولانا محمد فاروق کی ایک نظم اور ایک قصیدہ بھی ہے جو بالترتیب ملکہ وکٹوریہ کے پچاہ سالہ جشنِ جوبلی (۱۸۸۷ء) اور شصت سالہ جوبلی کے موقع پر لکھے گئے۔ اور ملکہ ممدوحہ کا مرثیہ بھی ہے۔ وفاداری کا یہ اظہار مقتضیاتِ زمانہ (و جاگیر) میں سے تھا۔ لیکن قصیدہ میں اردو (اور ندوہ) کے مشہور دشمن انٹونی میکڈانل کی زوردار تعریف نظر میں کھٹکتی ہے۔ وہ اس وقت حاکمِ صوبہ تھا اس لیے اسے بھی مقتضائے حال سمجھ لینا چاہیے۔

تھے تو مولانا کے علم و فضل سے واقف ہوئے۔ ان سے توراۃ و انجیل و زبور کے ان مسائل کو جو یہودیوں اور مسلمانوں میں مشترک ہیں حل کرنے میں مدد لی۔ بعض مسائل پر ان سے رسالے لکھوائے۔ جن میں سے ایک آدھ سرسید کی تفسیر میں بھی شامل ہے۔ بلکہ سلیمان ندوی ایک مضمون میں جو علامہ شبلی کے متعلق ۱۹۱۵ء میں لکھا گیا اور اب یادِ رفتگان میں فاتحہ الباب کی حیثیت رکھتا ہے۔ فرماتے ہیں:

"مولانا عنایت رسول صاحب چریاکوٹی تحقیقاتِ مذہبی میں گویا سرسید کے استاد تھے"[۳]

مولوی اقبال احمد سہیل اپنی ناتمام سیرتِ شبلی میں جس کے بعض اجزا سید صاحب کی حیاتِ شبلی میں لفظ بلفظ محفوظ کیے گئے ہیں لکھتے ہیں:

"یہ مانا کہ مولانا فاروق تحریکِ جدید کے بڑے مخالفوں میں سے تھے مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرسید نے اپنی تفسیر میں جو جدت طرازیاں کی ہیں وہ خود ان کے دل و دماغ کی پیداوار نہ تھیں، بلکہ ان کا بڑا حصہ مولانا فاروق کے بڑے بھائی مولانا عنایت رسول چریاکوٹی مرحوم کے خرمنِ کمال سے مستعار تھا۔"[۴]

مولانا محمد فاروق کی علمی قابلیت کا ہم ذکر کر چکے۔ انھوں نے دوسرے مشاہیر علما کے علاوہ مولانا عنایت رسول سے بھی تعلیم پائی۔ لیکن وہ اپنے بڑے بھائی کی طرح چریاکوٹ میں گوشہ نشین نہ ہو گئے۔ انھوں نے وکالت کی سند بھی حاصل کی لیکن اصل توجہ درس و تدریس پر تھی۔ وہ مختلف وقتوں میں چشمۂ رحمت غازی پور (مولانا شبلی کے والد کے قایم کردہ) مدرسہ عربیہ اعظم گڑھ سہسرام کے مدرسہ خانقاہ الٰہ آباد کے مدرسہ احیاء العلوم اور ندوہ کے دار العلوم سے متعلق رہے۔ وہ قدیم مدرس کے زاویۂ نگاہ سے خوب واقف تھے۔ اور اس کے با اثر ترجمان تھے۔

مولانا محمد فاروق ایک بوقلموں شخصیت کے عالم اور بڑی قابلیتوں کے انسان تھے۔ بقول مولوی ضیاء الحسن: "نرے کھرے مولوی نہ تھے۔ قانون اور زمینداری خوب سمجھتے

---

[۳] یادِ رفتگان (کراچی ۱۹۵۵ء) ص ۱۴۔

[۴] الاصلاح سرائے میر، بابت مارچ ۱۹۳۸ء ص ۱۵۵۔

تھے۔ وکالت بھی کر چکے تھے۔" بلکہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ "موسیقی کے فن میں بھی ان کو دسترس حاصل تھی"[۵] لیکن ان کی دلچسپی کا اصل مرکز ادب اور معقولات تھے۔ جن میں وہ یگانہ روزگار تھے۔ ان کے رسالہ "تذکرۃ العلوم" کے آخر میں جناب حبیب الدین معلم درس گاہ دارالعلوم (ندوۃ) کی ایک تقریظ ہے جس میں مولانا کی نسبت کہا گیا ہے: "اس زمانے میں شفائے شیخ (بوعلی سینا) و شرح اشارات و حاشیہ قدیمہ وغیرہ کتابیں آپ کے درس ہی میں نظر آتی ہیں۔ فنونِ ریاضی میں (اقلیدس کی کتاب) مناظر و اکر وغیرہ آپ ہی کے درس سے اس وقت زندہ ہیں۔" طبیعت کی وارستگی کے باوجود ہونہار طلبا کی تدریس و تعلیم میں مولانا جان نچھاور کرتے تھے۔ منتخب طلبا کی معلومات میں اضافہ اور علم متعلقہ کی سمجھ بوجھ بڑھانے کے علاوہ مولانا کی کوشش رہتی کہ طلبا کو علم سے دلی لگاؤ پیدا ہو جائے۔ وہ خود بھی فنا فی العلم تھے اور یہ محض اتفاق نہ تھا کہ ان کا چہیتا شاگرد آگے چل کر شمس العلماء علامہ شبلی نعمانی ہوا۔ نصاب میں اصلاح کا بھی ان کو ایک حد تک خیال تھا۔ انھیں اس بات کا پورا احساس تھا کہ قدیم طریقۂ تعلیم میں ابتدائی علوم مثلاً، صرف و نحو کی جو کتابیں تھیں ان کی وجہ سے طالب علم کا بڑا وقت تلف ہوتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے "نحو اور صرف کے سہل کرنے کی غرض سے کچھ رسالے نئے اسلوب سے درست کیے۔" ان میں سے منظومۂ نحویہ ندوہ کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ اور وہاں مستعمل تھا۔ طالب علموں کی مہارت بڑھانے کے لیے وہ نئے نئے طریقے رائج کرتے۔ مثلاً "جب وہ ندوہ میں صدر مدرس تھے، تو طالب علموں میں عربی اشعار کے یاد کرنے کا ذوق پیدا کرنے کے لیے عربی اشعار کی بیت بازی شروع کی۔ ہر پنجشنبہ کو تعلیم کے اوقات میں ایک محفلِ مکالمہ برپا ہوتی اس میں طلبہ ایک دوسرے سے سوال و جواب کرتے۔ کسی دن منطقی مسائل پر بھی بحث ہو جاتی۔" مولانا کو فارسی شعر سے خاص مناسبت تھی جس کی عربی مدارس میں بہت قدر نہیں۔ اردو فارسی کے قادر الکلام شاعر تھے اور فنِ مناظرہ کے بھی سارے کرتب جانتے تھے[۵۶]

مولانا محمد فاروق بڑی خوبیوں کے مالک تھے لیکن اہل نظر جانتے تھے کہ کبھی کبھی خوب تر

---

[۵] حیاتِ شبلی ص ۷۳

[۵۶] مولانا فاروق کی تدریسی خوبیوں (اور ندوۃ کے ابتدائی دور)

(باقی حاشیہ صفحہ ۷ پر ہے)

کے راستے میں خوب سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتا ہے۔ مولانا کو علم سے بڑی محبت تھی اور درس و تدریس کے معاملے میں ان کا نقطۂ نظر بھی عربی مدارس کے عام نقطۂ نظر سے وسیع تھا لیکن جن علوم کو وہ پسند کرتے تھے ان سے باہر نکلنا انھیں گوارا نہ تھا۔ ان کی کتاب تذکرۃ العلوم، مسدس عوالی کے ساتھ ۱۳۱۹ ہجری یعنی ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔ جب علیگڑھ کالج کی بنا کو پچیس سال ہوئے تھے اور ملک میں جدید علوم کی ضرورت عام طور پر محسوس ہو رہی تھی لیکن مولانا فاروق ان میں سے کسی کو نصاب میں جگہ دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کے زمانے میں (مولانا شبلی کی ان تحریروں سے ہی جو انھوں نے علی گڑھ جا کر اور سر سید کے وسیع کتب خانے سے مستفید ہو کر لکھیں) تاریخ اسلام کے متعلق کافی مواد سامنے آگیا تھا اور مولانا نے بھی لکھا۔ ”اسلام کے علوم میں سے علم تاریخ بھی ہے۔ (کاش وہ یہ بھی بتاتے کہ درس نظامی یا اسلامی درس کے کسی اور نظام میں عام تاریخ نہیں، مسلمانوں کی تاریخ کے لیے ہی کتنی گنجائش رکھی گئی ہے) یہ علم شرعی بھی ہے اور عقل کے بھی موافق ہے۔ اس فن میں مسلمانوں کی تصنیف کی کوئی انتہا نہیں۔“ لیکن صرف و نحو اور منطق کی متعدد شامل درس کتابوں کی جگہ مختصر مفید رسالوں کو جاری کر کے جن علوم کے لیے وہ وقت نکالنا چاہتے تھے ان میں تاریخ اسلام (یا فقہ، حدیث، تفسیر کی نادر کتب) شامل نہیں۔ اس ”اصلاح نصاب“ سے ان کا مقصد فقط ان کی محبوب ”معقولات“ کی زیادہ مکمل تعلیم تھا۔ رسالہ تذکرۃ العلوم میں فرماتے ہیں: ”فضول کتابوں کی تعلیم کی وجہ سے زمانہ اس قدر صرف ہوتا ہے کہ بہت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶) ——— کا بہترین مرقع مولوی ضیاء الحسن علوی مرحوم کی یاد ایام میں ملے گا۔ وہ ۱۸۹۸ سے ۱۹۰۵ء تک ندوہ میں زیر تعلیم رہے۔ سید سلیمان ندوی سے تعلیم کے درجہ میں ایک سال بڑے تھے لیکن دلی دوست بلکہ بقول سیّد صاحب ”یک جان دو قالب“ تھے۔ ندوہ سے فراغت کے بعد علیگڑھ کالج سے ایم اے کیا اور عربی مدرسوں کے انسپکٹر مقرر ہوئے تھے۔ ان کے خاص علمی محسن دو تھے۔ مولانا محمد فاروق چریاکوٹی اور علامہ شبلی نعمانی۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں: ”اصلاحِ نصاب کا وہ خاکہ جو استاد مرحوم (علامہ شبلی) صرف ندوہ کی حد تک کھینچ سکے تھے۔ ان کے لائق شاگرد (مولوی ضیاء الحسن) کے ہاتھوں وہ پورے صوبہ کے دائرہ میں وسیع ہو گیا۔“ (یادِ رفتگان صفحہ ۳۷۰)

سے مفید اور ضروری علوم سے لوگ محروم رہتے ہیں۔ ریاضی کی کتابوں میں فقط علم ہیئت کے دو رسالے زیر تعلیم ہیں اور باقی فنون سے جن کا ذکر کیا گیا، کوئی واقف نظر نہیں آتا۔ اسی طرح منطق کی تعلیم میں متعدد کتابوں کے پڑھانے میں لوگ مشغول ہیں۔ مگر قیاسات کے پورے ابحاث سے ناواقف اور صناعات خمسی کی فہرست تک نہیں جانتے۔ اور علم کلام میں ایک کتاب بھی تمام و کمال درس میں نہیں ہے اور علوم ادبیہ اکثر ناتمام پڑھے جاتے ہیں۔" (ص ۴۰)

یہاں تک تو غنیمت تھا کسی عالم کو ایک علم سے موانست ہوتی ہے۔ کسی کو دوسرے سے۔ لیکن دشواری اس وقت ہوتی ہے جب رواداری کو ترک کر دیا جائے اور مناظرانہ حربوں سے علوم جدیدہ کی یا قدیم علوم میں جو وسعتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ ان کی مخالفت ہی نہیں، تحقیر و تضحیک ہو۔ مثلاً علم جغرافیہ قدیم یونانیوں کے نزدیک علم ہیئت کی ایک شاخ تھا۔ ہمارے علمائے معقولات نے اسے اسی حیثیت سے اخذ کیا، لیکن زمانہ حال میں اسے جو وسعتیں حاصل ہوئی ہیں اور اس میں جو استفادی پہلو پیدا ہو گئے ہیں، انھیں وہ قبول کرنے کے لیے قطعاً تیار نہ تھے بلکہ "خدمتی قوموں" کا فن کہہ کر جدید جغرافیہ کی علمی حیثیت سے بالکل انکاری تھے۔ تذکرۃ العلوم میں لکھتے ہیں: "جغرافیہ: یہ ایک چھوٹا فن، ایک فصل علم ہیئت میں سے ہے۔ ہیئت کی ادنیٰ و مختصر کتابوں میں بھی یہ فن ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ تشریح الافلاک اور چغمنی میں بھی موجود ہے۔ اس فن سے مقصود زمین کے حصوں میں وہ حالات ہیں جو آفتاب کے قرب و بُعد اور اس کی شعاع کے مختلف طور سے پڑنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں جیسے دن کا بڑا چھوٹا ہونا۔ یا وہاں کے رہنے والوں کا کالا گورا ہونا۔ یا آب و ہوا کا کسی خاص تاثیر پر ہونا۔ اور اس قسم کے دوسرے حالات جو ثابت اور کلیات قسم کے ہیں۔ اس زمانے کے مدرسوں میں جغرافیہ میں ملکوں کے نرخناموں اور شہروں کی آبادی اور مردم شماری اور مشہور عمارتوں کی تفصیل جو حالات جزئیہ ہیں اور علمی مقاصد سے باہر ہیں، مذکور ہوئے۔ حقیقت میں یہ دفتر کے فنون میں سے ہے جس کی تعلیم خدمتی قوموں کو سلطنت کی جانب سے ہونی چاہیئے۔"

طب کی نسبت بھی ان کا نقطۂ نظر اسی طرح محدود اور قدامت پسندانہ بلکہ کسی قدر غیر علمی تھا۔ طب کو وہ علوم طبیعیہ کی ایک شاخ شمار کرتے ہیں جس کے چار حصے ہیں "یعنی علم معدنیات

علمِ نباتات وعلمِ حیوانات وعلمِ انسان"۔ یہ تقسیم شیخ بوعلی سینا کے وقت کی ہے۔ ان علوم کی جن شاخوں نے وسعت و ترقی پاکر مستقل علمی حیثیت اختیار کرلی تھی، مولانا فاروق ان کے قائل نہ تھے، بلکہ مغرب کی علمی ترقی کی اصل بنیاد دں، یعنی تجربہ اور مشاہدہ کو جنھیں فی الحقیقت پہلے پہل مسلمانوں نے علمی مرتبہ دیا تھا، اپنے منطقی استدلالوں کے مقابلے میں ہیچ سمجھتے تھے۔ مثلاً علمِ طب میں تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر جو اضافے مغرب میں ہوئے تھے ان کی نسبت لکھتے ہیں: "اہلِ یورپ اس فن کا دعویٰ محض تجربے کی بنیاد پر کرتے ہیں اور عقلی استدلال سے قطعاً ناواقف ہیں (کذا) یعنی مشاہدے پر کلی رائے قائم کرتے ہیں اور سبب و علت کو کچھ سمجھ نہیں سکتے۔ اس واسطے ان لوگوں کی تحقیقات قابل وثوق نہیں ہوتی۔" (ص ۲۳) مولانا معقولات کی محبت سے سرشار تھے۔ اگر وہ ٹھنڈے دل سے حقیقتِ حال پر نظر ڈالتے تو شاید انھیں خیال آتا کہ نہ صرف تجربہ اور مشاہدہ سے علم کی توسیع ہوتی ہے بلکہ وہ تو "عقلی استدلال" کے نتائج کو پرکھنے کی کسوٹی ہیں۔ ورنہ محض عقلی استدلال جو ہمارے علمائے معقولات کا اوڑھنا بچھونا ہے، وہی چیز ہے جس کی نسبت عارفِ روم نے کہا تھا ؎

پائے استدلالیاں چوبیں بود پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

اس سے بھی زیادہ افسوسناک تحقیر و حقارت کا وہ انداز ہے جو مولانا نے نئے علوم، مثلاً جغرافیہ، معاشیات (اکنامکس) کی نسبت اختیار کیا۔ تذکرۃ العلوم میں جو چیز بار بار اور طریقے طریقے سے دہرائی گئی ہے۔ اس کا اظہار ایک ابتدائی باب ("در بیان تفاوتِ نفوسِ انسانی در قبولِ انواعِ علوم") میں وضاحت سے کیا گیا ہے۔ "جو لوگ پست خیالی کے عادی ہیں وہ شہروں کے نام[۵۷] اور مردم شماری کے کاغذ اور بازاروں کے نرخناموں[۵۸] کو بڑا علم اور اعلیٰ مقصد قرار دیتے ہیں۔ اور جو لوگ عالی دماغ ہیں اور فراخ حوصلگی سے ان کا خمیر ہے ان کی توجہ کبھی اشیا کے حقائق میں غور کرنے سے اور علوی و سفلی موجودات کے نظم و ترتیب کے جاننے اور علت و معلول کی صلاحیتوں

۵۷، ۵۸ غالباً جغرافیہ اور معاشیات کی طرف اشارہ ہے۔ مسدس حالی میں جغرافیہ اور تاریخ پر طنز ہے ؎

"ہے اب کوئی شہروں کے ناموں پہ مرتا
کوئی نام راجاؤں کے ورد کرتا" (ص ۱۰)

کے سمجھنے سے اور اس میں رائے نکالنے سے فارغ نہیں ہوتی۔" (ص ۶) یہی اندازِ خیال مسدس عوالی میں نمایاں ہے۔ ہم لکھ چکے ہیں کہ تذکرۃ العلوم اور مسدس عوالی یکجا شائع ہوئے۔ یہ امر محض اتفاقی نہ تھا۔ تذکرۃ العلوم میں جس نقطۂ نظر کا اظہار نثر میں ہے وہی مسدس عوالی میں شعر کی صورت میں جلوہ گر ہے۔ یہ نظم حالی کے مشہور مسدس کے جواب میں لکھی گئی۔ مولانا فنِ مناظرہ اور الزام و جواب کے پرانے شہسوار تھے۔ اس لیے وہ اپنی دفاع و تقویت کے لیے بعض دوسری چیزیں لے آئے ہیں لیکن بنیادی طور پر مسدس عوالی اس تیر و نشتر کا جواب ہے جو حالی نے اپنے مسدس میں قدیم شاعری اور علوم، بالخصوص معقولات کی مروجہ تدریس اور یونانیوں کے علوم کو علمی ترقی کی معراج و انتہا سمجھنے پر چلائے تھے۔ مثلاً حالی نے قدیم فلسفہ و حکمت کی تعلیم پانے والوں کے متعلق لکھا تھا ؎

وہ جب کر چکے ختم تحصیلِ حکمت — بندھی سر پہ دستارِ علم و فضیلت
اگر رکھتے ہیں کچھ طبیعت میں جودت — تو ہے ان میں سب سے بڑی یہ لیاقت
اگر دن کو وہ رات کہہ دیں زباں سے
تو منوا کے چھوڑیں اسے اک جہاں سے

نہ سرکار میں کام پانے کے قابل — نہ دربار میں لب ہلانے کے قابل
نہ جنگل میں ریوڑ چرانے کے قابل — نہ بازار میں بوجھ اٹھانے کے قابل
نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کما کر
وہ کھو گئے آپ تعلیم پا کر

اور:

جو پوچھو کہ حضرت نے جو کچھ پڑھا ہے — مراد آپ کی اس کے پڑھنے سے کیا ہے
مفاد اس میں دنیا کا یا دین کا ہے — نتیجہ کوئی یا کہ اس کے سوا ہے
تو مجذوب کی طرح سب کچھ بکیں گے
جواب اس کا لیکن نہ کچھ دے سکیں گے

مولانا فاروق نے اس کا جواب عوالی میں دیا اس میں ذیل کے بند ان کے نظریۂ علم و فن کو بڑی

خوبی سے واضح کرتے ہیں ؎

ہر اک فن کا مقصود و مطلب جُدا ہے نہ اک فائدہ ہے، نہ اک مدعا ہے
علیحدہ مزا ان میں ہر ایک کا ہے کہے کوئی جاہل سے کیونکر کہ کیا ہے
کسی کیف کو کوئی سمجھائے کیوں کر
سمجھنے میں جُہال کے آئے کیوں کر
نہ پوچھو کہ مقصود پڑھنے سے کیا ہے کہ پڑھنا تو خود نفس کا مدعا ہے
یہی نفسِ انساں کی اصلی غذا ہے اسی سے حیات اور اسی سے بقا ہے
ہے دشوار حکمت کی علت بتانا
اسے جس کا ایماں ہے روٹی کمانا

بحث نے غیر ضروری طور پر تلخی کا رنگ اختیار کر لیا۔ ورنہ جس مسئلے کی نسبت اختلاف تھا، وہ کسی نہ کسی صورت میں اب بھی سامنے آتا رہتا ہے اور بنیادی طور پر ایک ایسا عمومی مسئلہ ہے جس سے تمام متمدن ملکوں کے اہلِ علم اور اہلِ فکر کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ تعلیم میں اس سوال کی اہمیت سے اہلِ نظر واقف ہیں۔ اور ادبیات میں "افادی ادب" اور "ادب برائے ادب" کی بحث کی تہ میں بھی وہی مسئلہ ہے جس پر حالی اور مولانا فاروق کو اس قدر اختلاف تھا لیکن جہاں تک مختلف علوم کی افادیت کا تعلق ہے، یہ اختلاف قدیم اور جدید کا اختلاف بھی نہیں فکر کے مختلف دبستانوں کا سوال ہے۔ مثلاً مروجہ علمِ معقولات کی عدم افادیت کی جو شکایت حالی نے کی ہے اس سے بھی زیادہ زور دار اظہارِ خیال دار العلوم دیوبند کے سابق سرپرست رشید احمد گنگوہی کا ہے۔ جن کے سوانح نگار مولانا عاشق الٰہی میرٹھی کہتے ہیں: "حضرت امام ربانی بار بار فرمایا کرتے تھے کہ اس منطق و فلسفہ سے تو انگریزی بہتر کہ اس سے دنیا کے نفع کی امید تو ہے[۵۹]"

مولانا فاروق کی نظم کا عنوان بڑا پُر معنی ہے۔ یہ غوالی یعنی عالی مرتبہ، عالی دماغ اور ذہنی طور پر بلند ہمت انسانوں کی آواز ہے۔ ہم نے مولانا کے جو خاندانی حالات درج کیے ہیں اور

---

[۵۹] تذکرۃ الرشید یہ جلد دوم ص ۵۰

ان کے علمی رتبہ کا جو بیان کیا ہے انھیں دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ انھیں طبقۂ عوالی کی ترجمانی کا پورا حق حاصل نہ تھا۔ لیکن افسوس زمانہ بڑا سنگدل ہے۔ جس قسم کی خالص علمی زندگی یہ علم کا متوالا چاہتا تھا، اسے نباہنے کے لیے ایک خاص طرز کا معاشرہ چاہیے جو ہندوستان میں اب سوائے دیسی ریاستوں یا گنتی کے چند مدرسوں کے کہیں میسر نہ تھا۔ شاید مولانا کو بھی اس کا احساس تھا۔ ان کا رسالہ تذکرۃ العلوم سفرِ رام پور کے بعد لکھا گیا۔ اس میں نواب حامد علی خان والئ رام پور کی علمی قدردانیوں اور اپنی مالی کمزوریوں کا اس طرح ذکر ہے کہ اگرچہ بیان میں بڑا رکھ رکھاؤ ہے، اور حفظہ اللہ تعالیٰ سے التجا ہے کہ وہ مصنف کی پریشانیوں کو دُور کرے۔ لیکن خیال ہوتا ہے کہ شاید کسی قدر یہ توقع بھی تھی کہ ممکن ہے رام پور کی علم پروری سے ایسا سامان ہو جائے کہ جس علمی نعمت سے خدا نے انھیں سرفراز کیا ہے، اسے "دوسرے فنون کی تصنیف" سے وہ اپنی "نجات اور خلق کی ہدایت کا وسیلہ" بنا سکیں۔ اگر انھیں یہ امید تھی تو وہ پوری نہ ہوئی۔ اور انھیں ندوہ کے دارالعلوم سے ہی منسلک رہنا پڑا۔ لیکن ۱۹۰۴ء میں یہاں بھی ایک انقلاب آ گیا۔ اب ان کا چہیتا شاگرد شبلی معتمدِ تعلیم مقرر ہوا۔ اور جلسۂ انتظامیہ نے فیصلہ کیا کہ دارالعلوم ان کے سپرد کیا جائے۔ اس فیصلہ کا مولانا محمد فاروق پر جو اثر پڑا اس کا بیان ان کے ایک عزیز شاگرد کے الفاظ میں دیکھیے[۱۰]:

"ہمارے مولانا کو جب اس انقلاب کی خبر ہوئی تو وہ اب یہاں ٹھہرتے ہوئے گھبرائے اور آخر کار اپنے خیر اندیشوں کے مشورہ سے خدمت سے سبکدوش ہو گئے۔ استاد شاگرد کی ماتحتی نہیں کر سکتا۔ علامہ (شبلی) نے جب سنا تو ان کو اس کا بے حد قلق ہوا۔ میری رائے میں بہتر ہی ہوا، ورنہ نظم میں فتور آتا۔"[۱۱]

---

[۱۰] یادِ ایام (ضیاء الحسن علوی) ص ۱۴۱۔

[۱۱] اس معمہ کو حل کرنے کے لیے مولانا محمد فاروق کی افتادِ طبع کا خیال رکھنا چاہیے۔ علامہ شبلی ان کی نسبت لکھتے ہیں "مزاج میں سخت وارستگی، بے پروائی اور بے تکلفی تھی۔" ضیاء الحسن صاحب کا بھی بیان ہے "ہمارے مولانا کسی قاعدے اور قانون کے پابند نہ تھے اور یہ پہلے سے سمجھ کر بلائے گئے تھے۔ اور یہ برتاؤ ساتھ نباہا گیا۔ ان کے یہاں اسباق اس طرح ہوتے کہ وہ لیٹے رہتے۔ کبھی کوئی طالبِ علم سر میں تیل دباتا اور کوئی پاچپی کرتا۔"

ندوہ کے دار العلوم کو چھوڑ کر اب کسی معمولی قدیم مدرسہ سے وابستہ ہونا مولانا فاروق کے لیے مشکل تھا۔ خاندانی زمینداری بڑھتے ہوئے خاندان کے لیے کافی نہ تھی۔ لاچار بلیا میں وکالت شروع کی لیکن وہ چلی نہیں۔ بعض شائق انگریز حکام کو عربی پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا، لیکن صورت حال تسلی بخش نہ تھی۔ اور سعادت مند شاگرد کو اس کا خیال رہتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۰۹ء میں مولانا شبلی نے مولانا کو دار العلوم میں ادیب اول کے عہدے پر بلایا۔ چند روزہ رہ کر اور صورت حال دیکھ وہ غازی پور گئے کہ اپنا ساز و سامان لے آئیں لیکن قضا و قدر کو یہ منظور نہ تھا۔ ۲۸ اکتوبر ۱۹۰۹ء کو غازی پور میں ہی وفات پا گئے۔

مولانا محمد فاروق کے آخری سال بڑی تلخی اور بے اطمینانی کے تھے۔ اور بادی النظر میں ان کی زندگی ایک ناکام زندگی نظر آتی ہے۔ لیکن یہ خیال بے جا ہے۔ وہ اگر اور کچھ نہ کرتے، فقط شبلی کی تربیت کر جاتے، تب بھی ان کا کام بیسیوں شمس العلماؤں سے زیادہ نتیجہ خیز تھا۔ علامہ شبلی نے متعدد سرچشموں سے فیض حاصل کیا۔ ان کا یہ فرمانا کہ میری تمام تر کائنات ان (مولانا محمد فاروق) ہی کے افادات ہیں۔ ایک عقیدت مند شاگرد کا جذباتی اظہار تشکر ہے۔ ایک غیر جانب دار مبصر کا محاکمہ نہیں۔ انھوں نے کئی معاملات میں استاد سے علیحدہ راستہ اختیار کیا۔ اور اپنی علمی اور ادبی صلاحیتوں کو ایک ذہنی لذت حاصل کرنے کے لیے نہیں، بلکہ قوم کی بعض بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لیے وقف رکھا۔ وہ اپنے استاد سے بہت آگے بڑھ گئے۔ لیکن پھر بھی ان کی ذہنی ساخت میں متعدد عناصر مولانا فاروق کا عطیہ تھے۔ علم سے والہانہ محبت، اعلیٰ ادبی مذاق، علمی جرأت، قدیم کی پاسداری۔ یہ سب چیزیں انھیں استاد سے ملیں۔ ان کی طبع اخاذ نے دوسروں سے بھی بعض اہم امور میں فیض حاصل کیا (جسے نظر انداز کرنے سے نہ صرف ان محسنوں سے بے انصافی ہوتی ہے بلکہ شبلی کی شخصیت بھی ایک حد تک نظر سے اوجھل ہو جاتی ہے) لیکن مولانا محمد فاروق نہ ہوتے تو علامہ شبلی نہ ہوتے۔ اور اگر خدانخواستہ علامہ شبلی نہ ہوتے تو علمی حیثیت سے ہماری جو حالت ہوتی اس کے تصور سے ہی طبیعت کو وحشت ہوتی ہے!